جھنیا بے اعتباری کی مسکراہٹ سے بولی: اسی طرح تو سب کہتے ہیں گوبر، بلکہ اس سے بھی میٹھے چکنے شبدوں (لفظوں) میں، اگر من میں کپٹ ہو تو مجھے بتا دو۔ ہشیار ہو جاؤں۔ ایسوں کو دل نہیں دیتی، اُن سے تو ہنس بول لینے ہی کا ناتا رکھتی ہوں۔ برسوں سے رودھے کرہاٹ جاتی ہوں۔ ایک سے ایک بابو، مہاجن، ٹھاکر، وکیل، عملے افسر اپنی چاہ دکھا کر مجھے پھنسا لینا چاہتے ہیں۔ کوئی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے جھنیا ترسامت"، کوئی مجھے رسیلی چتون سے گھورتا ہے جیسے پریم کے مارے بے سُدھ ہو گیا ہو۔ کوئی گہنے سب میری گلامی (غلامی) کرنے کو تیار رہتے ہیں، عمر بھر، بلکہ دوسرے جنم میں بھی! پر میں ان سبوں کی نس پہچانتی ہوں۔ سب کے سب بھونرے ہیں، رس لے کر اڑ جانے والے۔ میں بھی انھیں لبھاتی ہوں، ترچھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی، مسکاتی ہوں، وہ مجھے گدھی بناتے ہیں۔ میں انھیں الو بناتی ہوں۔ میں مر جاؤں تو ان کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے گا، دے مر جائیں تو میں کہوں گی کہ اچھا ہوا، مر گیا۔ میں تو جس کی ہو جاؤں گی اس کی جنم بھر کے لئے ہو جاؤں گی، سکھ میں، دکھ میں سمپت میں، بپت میں، اسی کے ساتھ رہوں گی، ہرجائی نہیں ہوں کہ سب سے ہنستی بولتی پھروں۔ نہ روپئے کی بھوکی ہوں، نہ گہنے کپڑے کی، بس بھلے آدمی کا ساتھ چاہتی ہوں جو مجھے اپنا سمجھے اور جسے میں بھی اپنا سمجھوں، ایک پنڈت جی بہت تلک چھاپا لگاتے ہیں۔ ادھ سیر دودھ لیتے ہیں ایک دن ان کی گھر والی کہیں نیوتے میں گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم؟ اور دنوں کی طرح دودھ لئے بھیتر چلی گئی۔ وہاں پکارتی ہوں، بہوجی! بہوجی! کوئی بولتا ہی نہیں۔ اتنے میں دیکھتی ہوں تو پنڈت جی باہر کے کواڑ بند کئے

چلے آرہی ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ اس کی نیت بُری ہے۔ میں نے ڈانٹ کر پوچھا تم نے کواڑ کیوں بند کر لیے؟ بہو جی کہیں گئی ہیں کیا؟ گھر میں سناٹا کیوں ہے؟"

اس نے کہا: "وہ ایک نیوتے میں گئی ہیں۔" اور میری طرف دو ڈگ (قدم) اور بڑھ آیا؟"

میں نے کہا: "تمھیں دودھ لینا ہو تو لو، نہیں میں جاتی ہوں"۔ بولا "آج تو تم یہاں سے نہ جانے پاؤ گی جھونا رانی! روج رمج (روز، روز) کلیجے پر چھری چلا کر بھاگ جاتی ہو۔ آج میرے ہاتھ سے نہ بچو گی۔"

تم سے سچ کہتی ہوں گوبر، میرے روئیں کھڑے ہو گئے۔

گوبر جوش میں بولا: "میں بچہ کو دیکھ پاؤں تو کھود کر گاڑ دوں، کھون (خون) پی لوں۔ تم مجھے دکھا تو دینا۔"

"سنو تو، ایسوں کا منہ توڑنے کے لئے میں ہی بہت ہوں میری چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ یہ کچھ کر بیٹھے تو کیا کروں گی؟ کوئی چلانا بھی نہ سنے گا۔ پر من میں یہ پکا کر لیا تھا کہ میری دیہہ (بدن) چھوئی تو دودھ بھری ہانڈی اس کے منہ پر پٹک دوں گی۔ چار پانچ سیر دودھ جا تو جائے، بچہ کو یاد تو ہو جائے گا۔ کلیجہ کڑا کر کے بولی اس پھیر میں نہ رہنا پنڈت جی! میں اہیر کی لڑکی ہوں، مونچھ کا ایک ایک بال چنوا لوں گی۔ یہی لکھا ہے تمھارے پوتھی پترے میں کہ دوسروں کی بہو بیٹی کو اپنے گھر میں بند کر کے اس کی آبرو لو؟ اسی لئے تلک چھاپے کا جال بچھائے بیٹھے ہو؟ لگا ہاتھ جوڑنے، پاؤں پڑنے، بولا، ایک چاہنے والے کا من رکھ لو گی تو تمھارا کیا بگڑ جائے گا جھونا رانی؟ کبھی کبھی گرسوں (غریبوں) پر دیا کیا کرو، نہیں بھگوان پوچھیں گے کہ ہم نے

تمہیں اتنا روپ کا دھن دیا تھا، تم نے اس سے ایک برہمن کا اپکار بھی نہیں کیا، تو کیا جواب دوگی؟ بولو! روپے پیسے کا دان تو سدا ہی پاتا ہوں، آج، روپ کا دان دو۔"

میں نے یونہی اس کا من پرکھنے کو کہہ دیا کہ میں پچاس روپے لوں گی سچ کہتی ہوں گوبر کہ وہ اسی دم کوٹھری میں گیا اور دس دس کے پانچ نوٹ وہیں گرا دیے اور دوارے کی طرف چلی تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا میں تو پہلے ہی سے تیار تھی، ہانڈی اس کے منہ پر دے ماری، سر سے پیر تک سرابور ہو گیا۔ چوٹ بھی بہت لگی۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لگا ہائے ہائے کرنے میں نے دیکھا کہ اب یہ کچھ نہیں کر سکتا تو پیٹھ میں دو لاتیں جما دیں اور کواڑ کھول کر بھاگی۔"

گوبر قہقہہ لگا کر بولا "بہت اچھا کیا تم نے دودھ سے نہا گیا ہوگا۔ تلک چھاپا بھی دھل گیا ہوگا۔ مونچھیں بھی کیوں نہ اکھاڑ لیں؟"

دوسرے دن پھر میں اس کے گھر گئی۔ گھر والی آ گئی تھی۔ وہ اپنے بیٹھکے میں سر پر پٹی باندھے پڑا تھا میں نے کہا، کہو تو کل کی تمہاری کرتوت کھول دوں، پنڈت! لگا ہاتھ جوڑنے۔ میں نے کہا، اچھا تھوک کر چاٹو تو چھوڑ دوں۔ دھرتی پر ہاتھ ٹیک کر کہنے لگا، اب میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے جھنیا، یہی سمجھ لو کہ پنڈتائن مجھے جیتا نہ چھوڑیں گی۔ مجھے بھی اس پر دیا آگئی۔"

گوبر کو یہ دیا بری لگی، بولا "یہ تم نے کیا کیا؟ اس کی عورت سے جا کر کہہ کیوں نہ دیا کہ جوتوں سے پیٹتی۔ ایسے پکھنڈیوں پر دیا نہ کرنی چاہیے

تم مجھے کل اس کی صورت دکھا دو، پھر دیکھنا کہ کیسی مرمت کرتا ہوں۔"

جھنیا نے اس کے ادھ کھلے شباب کو دیکھ کر کہا "تم اسے نہ پاؤگے پورا دیو ہے، سینت میت کا مال اڑاتا ہے کہ نہیں۔"

گوبر اپنے شباب کی یہ تحقیر کیسے برداشت کرتا؟ ڈینگ مار کر بولا "موٹے ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ یہاں پولاد (فولاد) کی ہڈیاں ہیں۔ تین سو ڈنڈ روج (روز) مارتا ہوں۔ دودھ گھی نہیں ملتا۔ نہیں تو اب تک سینہ یوں نکل آیا ہوتا" یہ کہہ کر اس نے اپنا سینہ تان کر دکھلایا۔

جھنیا نے تقویت بھری آنکھوں سے دیکھا، بولی "اچھا کبھی دکھا دوں گی پر یہاں تو سب ہی ایک سے ہیں، تم کس کس کی مرمت کروگے؟ نہ جانے مردوں کی کیا عادت ہے کہ جہاں کوئی جوان، سندر عورت دیکھی اور بس لگے گھورنے، چھاتی پیٹنے اور یہ جو بڑے آدمی کہلاتے ہیں یہ تو نرے لچالی ہوتے ہیں۔"

"پھر میں تو کوئی سندری بھی نہیں ہوں ......"

گوبر نے احتجاج کیا "تم! تمھیں دیکھ کر تو یہی جی چاہتا ہے کہ کلیجہ میں بٹھالیں۔"

جھنیا نے اس کی پیٹھ پر ایک ہلکا سا گھونسا جمایا "لگے اوروں کی طرح تم بھی چاپلوسی کرنے۔ میں جیسی کچھ ہوں، میں جانتی ہوں، پر ان لوگوں کو تو کوئی بھی جوان عورت مل جائے، گھڑی بھر من بہلانے کو اور کیا چاہیئے؟ گن تو آدمی اس میں دیکھتا ہے جس کے ساتھ جنم بھر نباہ کرنا ہو سنتی بھی ہوں اور دیکھتی بھی ہوں کہ آج کل بڑے گھروں کا عجب حال ہے جس محلے میں میری سسرال ہے اسی میں گپڈو گپڈو نام کے کاسمیری

(کشمیری) رہتے تھے۔ بڑے بھاری آدمی تھے۔ ان کے یہاں پانچ سیر دودھ لگتا تھا
اُن کے تین لڑکیاں تھیں۔ کوئی بیس بیس، پچیس پچیس برس کی، ایک سے ایک
سُندر۔ تینوں بڑے کالج میں پڑھنے جاتی تھیں۔ ایک سا ہیتا (شاید)
کالج میں پڑھاتی تھی اور تین سو کا مہینہ پاتی تھی۔ ستار وے سب بجاویں
ہارمونیا وے سب بجاویں، ناچیں وے، گاویں وے، پر بیاہ کوئی نہ کرتی
تھی۔ رام جانے وہ کسی مرد کو پسند نہیں کرتی تھیں کہ مرد ان ہی کو پسند
نہیں کرتے تھے، ایک بار میں نے بڑی بی بی سے پوچھا تو ہنس کر بولیں
کہ ہم لوگ یہ روگ نہیں پالتے۔ پر بھیتر ہی بھیتر گلچھرے اُڑاتی تھیں۔
جب دیکھوں دو چار لونڈے اُن کو گھیرے ہوتے ہیں۔ جو سب سے
بڑی تھی وہ تو کوٹ پتلون پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر مردوں کے ساتھ
گھومنے جاتی۔ سارے سہر میں ان کی لیلا کا چرچا تھا۔ گپڈو بابو سر نیچا
کئے جیسے منہ میں کالکھ سی لگائے رہتے تھے۔ لڑکیوں کو ڈانٹتے تھے،
سمجھاتے تھے، وے سب کی سب کھُلم کھُلا کہتی تھیں کہ تمہیں ہمارے
بیچ میں بولنے کا کچھ مجال نہیں ہے، ہم اپنے من کی رانی ہیں، جو ہمارا جی
چاہے گا کریں گی۔ بیچارا باپ جوان جوان لڑکیوں سے کیا بولے؟ مارنے
باندھنے سے رہا، ڈانٹنے ڈپٹنے سے رہا۔ پر بھائی، بڑے آدمیوں کی
باتیں کون چلاوے؟ وہ جو کچھ کریں سب ٹھیک ہے۔ انھیں تو برادری
اور پنچایت کا بھی ڈر نہیں ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ کسی کا
روج روج (روز روز) من کیسے بدل جاتا ہے۔ کیا آدمی گائے
بکری سے بھی گیا بیتا ہو گیا؟ پر کسی کو برا نہیں کہتی، بھائی من تو جیسا بناؤ
ویسا بنتا ہے۔ ایسوں کو بھی دیکھتی ہوں۔ جنھیں سدا کی دال روٹی کے

بعد کبھی کبھی منہ کا سواد (ذائقہ) بدلنے کے لئے حلوا پوری بھی چاہئے اور ایسوں کو بھی دیکھتی ہوں جنھیں گھر کی روٹی دال دیکھ کر جوڑی آتی ہے۔ کچھ بچاریاں ایسی بھی ہیں جو اپنی دال روٹی ہی میں مگن رہتی ہیں، حلوا پوری سے انھیں کوئی مطلب نہیں۔ میری دونوں بھاوجوں ہی کو دیکھو۔ ہمارے بھائی کا نئے کپڑے نہیں ہیں۔ دس جوانوں میں ایک جوان ہیں پر بھاوجوں کو نہیں بھاتے۔ انھیں تو وہ چاہئے جو سونے کی بالیاں بنوائے۔ مہین ساڑیاں لاوے اور روج چاٹ کھلاوے بالیاں اور ساڑیاں اور مٹھایاں مجھے بھی کم اچھی نہیں لگتیں مگر جو کہو کہ اُن کے لئے اپنی لاج بیچتی پھروں تو بھگوان اس سے بچاؤیں ایک کے ساتھ روکھا سوکھا کھا کر عمر کاٹ دینا، بس اپنا تو یہی راگ ہے۔ بہت کرکے تو مرد ہی عورتوں کو بگاڑتے ہیں۔ جب مرد اِدھر اُدھر تاک جھانک کرے گا تو عورت بھی آنکھیں لڑائے گی۔ مرد دوسری عورت کے پیچھے دوڑے گا تو عورت بھی دوسرے مرد کے پیچھے دوڑے گی۔ مرد کا ہرجائی ہونا عورت کو بھی اتنا ہی بُرا لگتا ہے جتنا عورت کا مرد کو۔ یہی سمجھ لو۔ میں نے تو اپنے آدمی سے ساپھ ساپھ (صاف صاف) کہدیا تھا کہ اگر تم اِدھر اُدھر لپکے تو میرے بھی جوجی میں آوے گا کروں گی۔ جو یہ چاہو کہ تم تو اپنے من کی کرو اور عورت کو مار کے ڈر سے اپنے بس میں رکھو تو یہ نہ ہوگا۔ تم کھلے کھجانے (خزانے) کرتے ہو وہ چھپ کر کرے گی۔ تم اُسے جلا کر سکھی نہیں رکھ سکتے۔"

گوبر کے لئے یہ ایک نئی دنیا کی باتیں تھیں۔ محو ہو کر سُن رہا تھا کبھی کبھی تو آپ ہی آپ اس کے پانوں رُک جاتے، پھر چپت کر چلنے لگتا

جھنیا نے پہلے اُسے اپنے روپ پر موہ لیا تھا، آج اُس نے اور تجربے سے بھری باتوں اور اپنی عصمت پروری کے ذکر سے اُسے اپنا گرویدہ بنالیا۔ ایسے رُوپ، گُن اور گیان والی عورت اُسے مِل جائے تو دھنیہ بھاگ! پھر وہ کیوں پنچایت اور برادری سے ڈرے؟

جھنیا نے جب دیکھ لیا کہ اس کا رنگ گہرا جم گیا تو سینے پر ہاتھ رکھ کر زبان کو دانت سے کاٹتی ہوئی بولی۔

"ارے یہ تو تمھارا گانوں آگیا! تم بھی بڑے چالاک ہو، مجھے کہا بھی نہیں کہ لوٹا جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ لوٹا پڑی۔

گوبر نے اصرار سے کہا "چھن (لمحہ) بھر کے لئے میرے گھر کیوں نہیں چلتی؟ اماں بھی تو دیکھ لیں۔"

جھنیا نے شرم سے آنکھیں چُرا کر کہا "تمھارے گھر یُوں نہ جاؤنگی مجھے تو یہی اچرج ہوتا ہے کہ میں اتنی دور کیسے آگئی۔ اچھا بتاؤ، اب کب آؤ گے؟ رات کو میرے دروا جے (دروازے) پر اچھی سنگت ہوگی۔ چلے آنا۔ میں اپنے پچھواڑے ملوں گی۔"

"اور جو نہ ملیں؟"

"تو لوٹ آنا۔"

"تو پھر میں نہ آؤں گا۔"

"آنا پڑے گا۔ نہیں تو کہے دیتی ہوں، ہاں!"

"تم بھی بچن دو کہ ملوگی۔"

"میں بچن نہیں دیتی"

"تو میں بھی نہیں آتا۔"

"میری بلا سے۔"

جھنیا انگوٹھا دکھا کر چل دی۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے پر اپنا اپنا اقتدار قائم کر چکے تھے۔ جھنیا جانتی تھی کہ وہ آئے گا؟ گوبر جانتا تھا کہ وہ ملے گی، کیسے نہ ملے گی؟ جب وہ تنہا گائے کو ہانکتا ہوا چلا تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ بہشت سے گر پڑا ہے۔

(۶)

جیٹھ کی گرم شام سمری کی سڑکوں اور گلیوں میں پانی کے چھڑکاؤ سے سرد و شاداب ہو رہی تھی۔ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں اور پودوں کے گملے سجا دئے گئے تھے اور بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ رائے صاحب اپنے کارخانے میں بجلی بنوا لیتے تھے۔ اُن کے سپاہی پیلی وردیاں پہنے اور نیلے صافے باندھے عوام پر رعب جماتے پھرتے۔ نوکر سفید کرتے پہنے اور زعفرانی رنگ کی پگڑیاں باندھے مہمانوں اور مکھیوں کی خاطر و مدارت کر رہے تھے۔ اُسی وقت ایک موٹر صدر دروازے کے سامنے آکر رُکا اور اس میں سے تین اصحاب اُترے۔ وہ جو کھدر کا کرتا اور چپل پہنے ہوئے تھے، انکا نام پنڈت اونکار ناتھ ہے۔ آپ بجلی نامے روزنامہ کے مشہور و معروف ایڈیٹر ہیں جنھیں دیش کی چنتا نے گھلا ڈالا ہے۔ دوسرے صاحب جو کوٹ پتلون میں ہیں، وہ ہیں تو وکیل، مگر وکالت نہ چلنے کے سبب ایک بیمہ کمپنی کی دلالی کرتے ہیں اور تعلقداروں کو مہاجنوں اور بینکوں سے قرض دلانے میں وکالت سے کہیں زیادہ کمائی کر لیتے ہیں۔ انکا نام ہے شیام بہاری تنخا اور تیسرے صاحب جو ریشمی اچکن اور چست پاجامہ پہنے ہوئے ہیں مسٹر بی مہتا یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ یہ تینوں صاحب رائے صاحب کے ہم سبقوں میں ہیں اور شگون کے جلسے میں مدعو ہوتے ہیں۔ آج سارے علاقے کے آسامی آئیں گے اور شگون کے روپئے نذر کریں گے۔ رات کو دھنش یگیہ ہوگا اور مہمانوں کی دعوت ہوگی ہوری نے پانچ روپئے شگون کو دیدئے ہیں اور ایک گلابی مرضائی پہنے، گلابی پگڑی باندھے، گھٹنے تک کا جھنی کا چھے، ہاتھ میں ایک کھرپی لئے اور چہرے پر پاوڈر ملے راجہ جنک کا مالی بن گیا ہے۔ اور گھمنڈ سے اتنا پھول اٹھا ہے گویا کل جلسہ

اُسی کی بدولت ہو رہا ہے۔

رائے صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ دوہرے بدن کے اونچے آدمی تھے گٹھا ہوا جسم، بارونق چہرہ، بلند پیشانی، گورا رنگ، اس پر شربتی رنگ کی چادر خوب پھب رہی تھی۔

پنڈت اونکار ناتھ نے پوچھا "کہئے کون سا ناٹک کھیلنے کا ارادہ ہے؟ میری دلچسپی کی تو یہاں وہی ایک چیز ہے۔"

رائے صاحب نے تینوں اصحاب کو خیمے کے سامنے کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا: "پہلے تو دھنش یگیہ ہوگا اور پھر اس کے بعد ایک مزاحیہ ڈرامہ، ناٹک تو کوئی اچھا نہ ملا۔ کوئی اتنا لمبا کہ شاید پانچ گھنٹوں میں نہ ختم ہو اور کوئی اتنا مشکل کہ شاید یہاں ایک آدمی بھی اس کا مطلب نہ سمجھے۔ آخر میں نے خود ایک مزاحیہ ناٹک لکھ ڈالا جو دو گھنٹوں میں پورا ہو جائے گا۔"

اونکار ناتھ کو رائے صاحب کی ڈرامہ نگاری میں بہت شک تھا۔ اُنکا خیال تھا کہ ذہانت تو غریبی ہی میں چمکتی ہے، چراغ کی طرح جو اندھیرے ہی میں اپنی روشنی ظاہر کرتا ہے۔ بے پروائی سے منہ پھیر لیا، جسے چھپانے کی بھی انھوں نے کوشش نہیں کی۔

مسٹر تنکھا ان بیکار باتوں میں نہ پڑنا چاہتے تھے۔ مگر پھر بھی رائے صاحب کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ اس کے متعلق انھیں کچھ کہنے کا حق ہے بولے: "ناٹک کوئی بھی اچھا ہو سکتا ہے اگر اس کے ایکٹر اچھے ہوں۔ عمدہ سے ناٹک برے ایکٹروں کے ہاتھ میں پڑکر برا ہو سکتا ہے جب تک اسٹیج پر تعلیم یافتہ ایکٹرسیں نہیں آتیں ہمارے ناٹکی فن کا اُدھار نہیں ہو سکتا۔ ابکے تو آپ نے کونسل میں سوالوں کی دھوم مچا دی میں تو دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی ممبر کا رکارڈ اتنا شاندار نہیں ہے۔"

فلسفہ کے پروفیسر مسٹر مہتا اس تعریف کو سہ نہ سکتے تھے۔ مخالفت تو کرنا چاہتے تھے مگر اصول کی آڑ لے کر انھوں نے حال ہی میں ایک کتاب کئی سال کی محنت سے لکھی تھی اسکی جتنی شہرت ہونی چاہیئے تھی اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوئی تھی جس سے وہ بہت مغموم تھے بولے بھئی میں سوالوں کا قائل نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری زندگی ہمارے اصولوں کے مطابق ہو آپ کسانوں کے بہی خواہ ہیں، انھیں انواع و اقسام کی مراعات دینا چاہتے ہیں، زمینداروں کے اختیارات چھین لینا چاہتے ہیں بلکہ انھیں تو آپ سکاج کی نحوست کہتے ہیں، مگر پھر بھی آپ زمیندار ہیں، ویسے ہی زمیندار جیسے ہزاروں اور ہیں اگر آپ کا خیال ہے کہ کسانوں کے ساتھ رعایت ہونی چاہیئے تو پہلے آپ خود شروع کریں۔ کسانوں کو نذرانہ لئے بغیر پٹے لکھ دیں، بیگار بند کر دیں، اضافہ لگان سے دست کش ہو جائیں، چراگاہیں چھوڑ دیں مجھے ان لوگوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے جو باتیں تو کرتے ہیں کمیونسٹوں کی سی، مگر زندگی ہے رئیسوں کی سی، اتنی ہی عیش پسندی اور خود غرضی سے معمور!"

رائے صاحب کو صدمہ ہوا۔ وکیل صاحب کے ہاتھ پر بل پڑ گئے۔ ایڈیٹر صاحب کے منہ پر کالکھ سی لگ گئی۔ وہ خود اشتراکیت کے پجاری تھے مگر براہ راست گھر میں آگ نہ لگانا چاہتے تھے۔

ٹنخا نے رائے صاحب کی وکالت کی "میں سمجھتا ہوں کہ رائے صاحب کا اپنے اسامیوں کے ساتھ جتنا اچھا سلوک ہے ویسا ہی اگر سبھی زمیندار برتیں تو یہ سوال ہی باقی نہ رہے۔"

مہتا نے ہتھوڑے کی دوسری چوٹ جمائی "مانتا ہوں آپ کا اپنے اسامیوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ ہے، مگر سوال تو یہ ہے کہ اس میں خود غرضی ہے یا نہیں؟ اس کا ایک سبب کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ دھیمی آنچ میں کھانا ذائقہ دار پکتا ہے؟

گر اُس سے مارنے والا زہر سے مارنے والے کی بہ نسبت کہیں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم یا تو سوشلسٹ ہیں یا نہیں ہیں۔ ہیں، تو ویسا برتیں بھی، ورنہ بکنا چھوڑ دیں۔ میں نقلی زندگی کے خلاف ہوں۔ اگر گوشت کھانا اچھا سمجھتے ہو تو علانیہ کھاؤ، بُرا سمجھتے ہو تو نہ کھاؤ۔ یہ تو میری سمجھ میں آتا ہے مگر اچھا سمجھنا اور چھپ کر کھانا، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں اسے بزدلی بھی کہتا ہوں اور مکاری بھی جو دراصل ایک ہی ہیں۔"

رائے صاحب ایک صحبت یافتہ آدمی تھے، توہین اور صدمے کو صبر اور فراخدلی سے سہنے کی انھیں مہارت تھی۔ کچھ پس و پیش میں پڑ کر بولے "آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے مہتا جی! آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی صاف گوئی کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ مگر آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسری مسافتوں کی طرح خیالوں کی مسافت میں بھی منزلیں ہوتی ہیں، اور آپ ایک منزل کو چھوڑ کر دوسری منزل میں نہیں جا سکتے۔ انسانی زندگی کی تاریخ اس کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ میری پرورش اس ماحول میں ہوئی ہے جہاں بادشاہ خدا ہے اور زمیندار خدا کا شریک ہے۔ میرے والد مرحوم اسامیوں پر اتنی دیا کرتے تھے کہ پالے سوکھے میں کبھی نصف اور کبھی پورا لگان معاف کر دیتے تھے اپنے ذخیرے سے اناج نکال کر اسامیوں کو کھلا دیتے تھے۔ گھر کے زیور بیچ کر لڑکیوں کے بیاہ میں مدد دیتے تھے مگر یہ سب اُسی وقت تک جب رعایا انھیں سرکار اور دھرما دتار کہتی رہے، اُنھیں اپنا دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی رہے۔ رعایا کو پالنا اُن کا سناتن دھرم تھا مگر اختیار کے نام پر وہ کوڑی کا دندانہ بھی چھوڑ کر دینا نہ جانتے تھے۔ میں اُسی ماحول میں پلا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں عملاً خواہ کچھ کر گزرا دوں میں اُن سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ اور یہ ماننے لگا ہوں کہ جب تک کسانوں کو یہ رعایتیں اختیاری شکل میں نہ ملیں گی اس وقت تک صرف نیک

خیالی کی بنیاد پران کی حالت میں سُدھار نہیں ہو سکتا۔ اپنی خوشی سے بے غرض بن جانا تو مستثنیات میں سے ہی۔ میں خود اچھا خیال رکھتے ہوئے بھی اپنا سُوارتھ نہیں چھوڑ سکتا اور چاہتا ہوں کہ ہمارے طبقے کو حکومت کی طاقت اور طرزِ عمل کے ذریعے سے اپنا سوارتھ چھوڑ دینے کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ اسے آپ بُزدلی کہیں گے میں مجبوری کہتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ کسی کو بھی دوسروں کی محنت پر موٹے ہونے کا حق نہیں ہی۔ دوسروں کے بل پر جینا انتہائی بے غیرتی ہی۔ کام کرنا جملہ جانداروں کا دھرم ہی۔ سماج کی یہ تقسیم تدوین جس میں کچھ لوگ مفت مزے اڑائیں اور بیشتر آدمی مرا کھپا کریں، کبھی راحت بخش نہیں ہو سکتی۔ پونجی اور تعلیم جسے میں پونجی ہی کا ایک پہلو سمجھتا ہوں، ان کا گڑھ جتنی جلد ٹوٹ جائے اتنا ہی اچھا جنھیں پیٹ کو روٹی میسر نہیں ان کے افسر دس دس پانچ پانچ ہزار پاتے رہیں۔ یہ ہنسنے کے قابل ہی اور شرم کے بھی! اس نظام نے ہم زمینداروں میں کتنی عیش پسندی، کتنی بدچلنی، کتنی غلامی اور کتنی بے شرمی بھر دی ہی، یہ میں خوب جانتا ہوں مگر میں ان ہی وجوہ سے اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ میرا تو یہ کہنا ہی کہ اپنے سُوارتھ کے خیال سے بھی اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ اس شان کو نبھانے کے لئے ہمیں اپنے ضمیر کا اتنا خون کرنا پڑا ہی کہ ہم میں خودداری کا نام بھی نہیں رہ گیا ہی۔ ہم اپنے اسامیوں کو لوٹنے کے لئے مجبور ہیں۔ اگر افسروں کو قیمتی قیمتی ڈالیاں نہ دیں تو باغی سمجھے جائیں اور شان و شوکت سے نہ رہیں تو کنجوس کہلائیں۔ انقلابی تحریک کی ذرا سی آہٹ پر ہم کانپ اٹھتے ہیں اور افسروں کے پاس فریاد لے کر دوڑتے ہیں کہ ہمیں بچائیے۔ ہمیں اپنے پر اعتبار نہیں رہا۔ اور نہ ہم میں مردانگی ہی رہ گئی ہی۔ بس ہماری حالت ان بچوں کی سی ہی جنھیں چمچ سے دودھ پلا کر پالا جاتا ہی۔ باہر سے موٹے مگر واقعی کمزور بے بس اور محتاج!"

مہتا نے تالی بجا کر کہا "ہیئر! ہیئر! (سنو سنو) آپ کی زبان میں جتنی عقل ہی

کاش اس کی نصف بھی دماغ میں ہوتی! افسوس یہی ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ اپنے خیالات پر عمل نہیں کر سکتے۔"

اونکار ناتھ بولے: "اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا، مسٹر مہتا! ہمیں وقت کے ساتھ چلنا بھی ہے اور اسے اپنے ساتھ چلانا بھی۔ بُرے ہی کاموں میں مدد کی ضرورت نہیں ہوتی، اچھے کاموں کے لئے بھی مدد کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ آپ ہی کیوں آٹھ سو روپے مہینے ہڑپ کرتے ہیں جبکہ آپ کے گروڑوں بھائی صرف آٹھ روپے میں اپنا نباہ کر رہے ہیں؟"

رائے صاحب نے ظاہرا افسوس لیکن باطنی اطمینان سے ایڈیٹر صاحب کو دیکھا اور بولے "شخصی باتوں کی تنقید نہ کیجئے، ایڈیٹر صاحب! ہم یہاں سماج کے نظام پر غور کر رہے ہیں۔"

مسٹر مہتا ویسے ہی ٹھنڈے دل سے بولے "نہیں، میں اُسے بُرا نہیں سمجھتا۔ سماج شخصوں سے بنتا ہے اور شخص کو بھول کر ہم کسی نظام پر غور نہیں کر سکتے اس لئے اتنی تنخواہ لیتا ہوں کہ میرا اس نظام پر اعتقاد نہیں ہے۔"

ایڈیٹر صاحب کو حیرت ہوئی "اچھا تو آپ موجودہ نظام کے حامی ہیں؟"

میں اس اصول کا حامی ہوں کہ دنیا میں چھوٹے بڑے ہمیشہ رہیں گے اور انھیں ہمیشہ رہنا چاہیئے۔ اسے مٹانے کی کوشش کرنا بنی نوع انسان کی تباہی کا موجب ہوگا۔"

کشتی کا جوڑ بدل گیا۔ رائے صاحب الگ کھڑے ہو گئے اور ایڈیٹر صاحب اکھاڑے میں اُترے۔ "آپ اس بیسویں صدی میں اعلیٰ ادنیٰ کا فرق مانتے ہیں؟"

جی ہاں، مانتا ہوں، اور بڑے زوروں سے مانتا ہوں جس مت کو آپ مانتے ہیں وہ بھی تو کوئی نیا مت نہیں ہے۔ جب سے انسان میں خودی کا ارتقاء ہوا جب ہی سے اس مت کا جنم ہوا۔ بدھ اور افلاطون اور عیسیٰ سب ہی سماج میں مساوات کے مبلغ تھے۔ یونان اور روم اور شام سب ہی نے اس کی آزمائش کی مگر غیر قدرتی ہونے کے سبب کبھی وہ دیرپا نہ رہ سکی۔"

"آپ کی باتیں سن کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔"

"تعجب نادانی کا دوسرا نام ہے۔"

میں آپ کا شکر گذار ہوں گا، اگر آپ اس پر مضامین کا کوئی سلسلہ شروع کر دیں۔"

"جی! میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ اچھی رقم دلائیے تو البتہ۔"

"آپ نے اصول ہی ایسا لیا ہے کہ علانیہ عوام کو لوٹ سکتے ہیں۔"

"مجھ میں اور آپ میں فرق اتنا ہی ہے کہ میں جو کچھ مانتا ہوں اس پر عمل کرتا ہوں اور آپ لوگ مانتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ دولت کو آپ کسی بے انصافی کے ذریعہ برابر پھیلا سکتے ہیں، مگر عقل، کردار، خوب صورتی، ذہانت اور طاقت کو برابر پھیلا دینا تو آپ کی سکت سے باہر ہے۔ چھوٹے بڑے کا فرق صرف دولت ہی سے نہیں ہوتا۔ میں نے بڑے بڑے دولت مندوں کو فقیروں کے سامنے گھٹنے ٹیکتے دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا حسن کے چوکھٹ پر بڑے بڑے راجے ناک رگڑتے ہیں۔ کیا یہ تمدنی افتراق نہیں ہے؟ آپ روس کی مثال دیں گے۔ وہاں اس کے سوا اور کیا ہے کہ مل کے مالک نے سرکاری نوکر کا روپ لے لیا ہے؟ عقل پہلے

بھی حکومت کرتی تھی اور آگے بھی ہمیشہ کرے گی۔"

طشتری میں پان آ گئے تھے، رائے صاحب نے مہمانوں کو پان، الائچی دیتے ہوئے کہا "عقل اگر خود غرضی سے بری ہو تو ہمیں اس کا اقتدار ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ سوشلزم کا یہی معیار ہے۔ ہم سادھو مہاتماؤں کے سامنے اسی لئے سر جھکاتے ہیں کہ ان میں تیاگ (ترک) کا بل ہے۔ اسی طرح ہم عقل کے ہاتھ میں اختیار بھی دینا چاہتے ہیں، وقار بھی، اور لیڈری بھی مگر دولت کبھی نہیں۔ عقلی اختیار اور وقار شخص کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن اس کی دولت بس ہونے کے لئے اس کے بعد اور بھی طاقتور ہو جاتی ہے۔ عقل کے بغیر کوئی سماج نہیں چل سکتا۔ ہم تو صرف اس بچھو کا ڈنک توڑنا چاہتے ہیں۔"

دوسرا موٹر آ پہنچا اور مسٹر کھنا اترے جو ایک بینک کے منیجر اور شکر مل کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ دو عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ رائے صاحب نے ان دونوں کو اتارا۔ وہ جو کھدر کی ساڑھی پہنے ہوئے بہت متین و دور اندیش سی ہیں، مسٹر کھنا کی بیوی کامنی کھنا ہیں۔ دوسری جو اونچی ایڑی کا بوٹ پہنے ہوئے ہیں اور جن کے حسین چہرے سے ہنسی پھوٹی پڑتی ہے، مس مالتی ہیں جو انگلستان سے ڈاکٹری پڑھ آئی ہیں اور اب پریکٹس کرتی ہیں۔ تعلقداروں کے محلوں میں ان کی بڑی آمد و رفت ہے۔ آپ نئے جگ کی مجسم مورت ہیں۔ نازک اندام مگر شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی، جھجک کا کہیں نام بھی نہیں۔ وضع میں مکمل، بلا کی حاضر جواب مردانہ جذبات کی ماہر، کھیل کود کو زندگی کا ماحصل سمجھنے والی، لبھانے اور رجھانے کے فن میں طاق، جہاں روح کا مقام ہے وہاں ظاہرداری، جہاں

دل کی جگہ ہے وہاں ناز و انداز، دلی جذبات پر اچھا قبضہ جس میں رغبت یا خواہش کا فقدان سا ہو گیا ہے!

آپ نے مسٹر مہتا سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "سچ کہتی ہوں، آپ صورت سے فلسفی معلوم ہوتے ہیں۔ اس نئی کتاب میں آتما کے ماننے والوں کو اُدھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ پڑھتے پڑھتے کئی بار دل میں آیا کہ آپ سے لڑ جاؤں۔ فلاسفروں میں ہمدردی کیوں نہیں ہوتی؟"

مہتا صاحب جھینپ گئے۔ کنوارے تھے اور نئے جگ کی عورتوں سے پناہ مانگتے تھے۔ مردوں کی جماعت میں خوب چہکتے تھے مگر جیوں ہی کوئی عورت آئی اور آپ کی زبان بند ہوئی۔ جیسے عقل پر قفل لگ جاتا تھا عورتوں سے مہذبانہ سلوک تک کرنے کا ہوش نہ رہتا تھا۔

مسٹر کھنا نے پوچھا "فلاسفروں کی صورت میں کیا خاص بات ہوتی ہے، دیوی جی؟"

مالتی نے مہتا کی طرف رحم سے دیکھ کر کہا "مہتا جی بُرا نہ مانیں تو بتا دوں۔"

کھنا صاحب مس مالتی کے پرستاروں میں سے تھے۔ جہاں مس مالتی جائیں وہاں کھنا کا پہنچنا لازمی تھا۔ ان کے آس پاس بھونرے کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ ہر وقت ان کی یہی خواہش رہتی تھی کہ مالتی سے زیادہ سے زیادہ وہی بولیں اور اس کی نگاہ زیادہ سے زیادہ ان ہی پر رہے۔

کھنا نے آنکھ جھپکا کر کہا "فلسفی کسی کی بات کا بُرا نہیں مانتے اُن میں یہی تو وصف ہے۔"

"تو سنئے فلسفی ہمیشہ مردہ دل ہوتے ہیں۔ جب دیکھئے اپنے خیالوں میں غرق بیٹھے ہیں! آپ کی طرف تاکیں گے مگر آپ کو دیکھیں گے نہیں، آپ ان سے باتیں کئے جائیں لیکن وہ کچھ سنیں گے نہیں، جیسے خلا میں اڑ رہی ہوں۔"

سب لوگوں نے قہقہہ لگایا، مہتا صاحب گویا زمین میں گڑ گئے!

"آکسفورڈ میں میرے فلسفہ کے پروفیسر مسٹر ہسبینڈ تھے....."

کھنا نے ٹوکا "نام تو نرالا ہے۔"

"جی ہاں، اور تھے کنوارے....."

"مسٹر مہتا بھی تو کنوارے....."

"یہ روگ سبھی فلاسفروں کو ہوتا ہے۔"

اب مہتا کو موقع ملا، بولے "آپ بھی تو اسی مرض میں مبتلا ہیں۔"

میں نے عہد کیا ہے کہ کسی فلاسفر ہی سے شادی کروں گی اور یہ طبقہ شادی کے نام سے گھبراتا ہے۔ ہسبینڈ صاحب عورت کو دیکھ کر گھر میں چھپ جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں کئی لڑکیاں تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی کبھی کچھ پوچھنے کے لئے ان کے دفتر میں چلی جاتی تو آپ ایسے گھبرا اٹھتے جیسے کوئی شیر آگیا ہو۔ ہم لوگ انھیں خوب چھیڑتے تھے۔ مگر تھے بے چارے بڑے ہی سادہ مزاج۔ کئی ہزار کی آمدنی تھی مگر میں نے انھیں سدا ایک ہی سوٹ پہنے دیکھا ان کی ایک بیوہ بہن تھی۔ وہی ان کے گھر کا سارا انتظام کرتی تھی۔ مسٹر ہسبینڈ کو تو کھانے پینے کی فکر ہی نہ رہتی تھی۔ ملنے والوں کے ڈر سے

کمرے کا دروازہ بند کرکے لکھا پڑھا کرتے تھے۔ کھانے کا وقت آجاتا تو
ن کی بہن آہستہ اندر کے دروازے سے ان کے پاس جاکر ان کی کتاب
کر دیتی تھی۔ جب ہی انھیں معلوم ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت آگیا۔ رات کو بھی
کا وقت مقرر تھا۔ ان کی بہن کمرے کی بتی بجھا دیا کرتی۔ ایک دن بہن
کتاب بند کرنا چاہا تو آپ نے اسے دونوں ہاتھ سے دبا لیا اور بہن
ئی میں زور آزمائی ہونے لگی۔ آخر بہن ان کی پہیئے دار کرسی کو کھینچ کر کھانے
کمرے میں لے گئی۔"

رائے صاحب بولے "مگر مہتا صاحب تو بڑے خلیق اور خوش مزاج
ورنہ اس ہنگامے میں کیوں آتے؟"

"تو آپ فلاسفر نہ ہوں گے۔ جب اپنے تفکرات سے ہمارے سر
یں درد ہونے لگتا ہی تو پھر دنیا بھر کی فکر سر پر سوار کرکے کوئی کیسے خوش
ہ سکتا ہی؟"

اُدھر ایڈیٹر صاحب مسز کھنّا صاحبہ سے اپنی مالی پریشانیوں کی داستان
رہے تھے "بس یوں سمجھئے شریمتی جی کہ ایڈیٹر کی زندگی ایک طویل فریاد
جسے سُن کر لوگ رحم کے عوض کانوں پر ہاتھ دھر لیتے ہیں۔ بے چارہ
اپنا بھلا کر سکتا ہی نہ دوسروں کا۔ پبلک اس سے اُمید تو یہی رکھتی ہی
ہر تحریک میں وہ سب سے آگے رہے، جیل جائے، مار کھائے۔ گھر کا
ل اسباب قُرق کرائے، یہ اس کا فرض سمجھا جاتا ہی، مگر اس کی مشکلات
طرف کسی کو توجہ نہیں۔ ہو تو وہ سب کچھ، اسے ہر علم و فن کا ماہر
ی ہونا چاہیئے مگر اسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ آپ تو آج کل کچھ لکھتی
ی نہیں۔ خوش نصیبی سے آپ کی خدمت کرنے کا جو تھوڑا بہت موقع مجھے

ل سکتا ہی اس سے آپ مجھے کیوں محروم رکھتی ہیں؟"

شریمتی کھنا کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ اس ناتے سے ایڈیٹر صاحب کبھی کبھی ان سے مل آیا کرتے تھے۔ لیکن گھر کے کام دھندوں میں لگے رہنے کے سبب اِدھر بہت دنوں سے وہ کچھ لکھ نہ سکی تھیں۔ سچ بات تو یہ ہی کہ ایڈیٹر صاحب ہی نے انھیں حوصلہ دلا کر شاعر بنایا تھا۔ فطری ذکاوت ان میں بہت کم تھی۔

"کیا لکھوں؟ کچھ سوجھتا ہی نہیں! آپ نے کبھی مس مالتی سے کچھ لکھنے کو نہیں کہا؟"

ایڈیٹر صاحب نے بے رخی سے کہا "ان کا وقت قیمتی ہی، کامنی دیوی لکھتے تو وہ لوگ ہیں جن کے دل میں کچھ درد ہی، پریم ہی، لگن ہی، اور گیان ہی، جنھوں نے دولت اور عیش و عشرت کو زندگی کا مقصد بنا لیا وہ کیا لکھیں گے؟"

کامنی نے حسد آمیز تمسخر سے کہا: "اگر آپ اُن سے لکھا سکیں تو آپ کے اخبار کی اشاعت دونی ہو جائے۔ لکھنؤ میں تو ایسا کوئی طبیعت دار نہیں ہی جو آپ کا گاہک نہ بن جائے۔"

"اگر دولت میری زندگی کا مقصد ہوتی تو آج میں اس حالت میں نہ ہوتا۔ مجھے بھی دھن کمانے کا ڈھنگ معلوم ہی۔ آج چاہوں تو لاکھوں کما سکتا ہوں۔ مگر یہاں تو دولت کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ ادبی خدمت میری زندگی کا مقصد ہی اور رہی گا۔"

"کم سے کم میرا نام تو گاہکوں میں لکھا دیجئے۔"

"آپ کا نام گاہکوں میں نہیں، مُربّیوں میں لکھوں گا۔"